کتابیں جھانکتی ہیں!

شاکر احمد فاضل

معروف ڈراما نویس اور گیت نگار گلزار (پ: ۱۹۳۴ء، دینہ) کی یہ نظم پڑھیے تو خوب صورت لگے اور سوچیے تو کڑوی لگے۔ اس میں کڑوی سچائیوں کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم حوالۂ قرطاس ہے، تاکہ قاری اس نظم کو نہ صرف پڑھے بلکہ محسوس بھی کر سکے:

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے،
بڑی حسرت سے تکتی ہیں،
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں،
اب اکثر، گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔
جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ بناتی تھیں
وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں۔
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے

کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتوں کے سوکھے ٹُنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ،
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے۔
بہت سی اصطلاحیں ہیں،
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں،
گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے
بس اِک جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردے پر،
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی سینے پر رکھ کر لیٹ جاتے تھے،
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آیندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
ان کا کیا ہوگا؟

اس نظم کا ایک ایک مصرع سچا ہے اور اسی لیے نہایت کڑوا بھی ہے، مگر اس کڑواہٹ کو شاعر نے شکایتوں کی دل آویز پوشاکیں دی ہیں۔ یہ کیسا گلہ ہے؟ یہ کیسی شکایت ہے؟ مگر کس سے گلہ کیا جارہا ہے اور کس کی شکایت کی جارہی ہے؟ اس صورتِ حال کا آخر ذمہ دار کون ہے؟ زمانے کو تو کہہ نہیں سکتے کہ ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے، البتہ انسان کی ذہنی ترقی کو 'الزام' دے سکتے ہیں، کیوں کہ ترقی کے نام پر انسان، انسانیت کو جو کچھ دے رہا ہے، اس میں نقصان کا پہلو ہی زیادہ

نمایاں نظر آ رہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی اس برق رفتار ترقی نے انسان کو مشین کا ایک کل پُرزہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ ایسے میں وہ فطرت سے دُور اور غیر فطری ماحول کا عادی بنتا چلا جا رہا ہے۔

بات احساس کی ہے..... کتابوں سے مضبوط رشتہ استوار رکھنے والا اور کتابوں سے نزدیک رہنے والا روزانہ کتابیں اٹھاتا اور انھیں محبت سے رکھتا ہے۔ اپنی کتابوں کی ترتیب اور ان کی صفائی، یا پھر کسی اہم کتاب کی تلاش اسے کتابوں سے بہت ہی قریب رکھتی ہے۔ الماری کے باہر سے کتابوں کو دیکھتا ہے، مگر اس نظم میں شاعر نے تو کتابوں کو جھانکتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ بتاتے ہیں:

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے، بڑی حسرت سے تکتی ہیں، مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں۔ جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر۔ بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں، انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے۔

نظم کا پہلا مصرع پڑھ کے چونکیے گا نہیں..... کتابوں کا جھانکنا اور ان کا تکنا چہ معنی دارد؟ ایسا کرتے ہیں کہ ہم کتابوں کو ذی روح مان کر چلتے ہیں۔ یہ کتابیں اس حد تک مجبور ہیں کہ خود سے باہر نہیں نکل سکتیں، کوئی انھیں نکالنے والا چاہیے۔ کسی کے انتظار میں شیشوں سے جھانکے جا رہی ہیں، اور جب یہ انتظار برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو ان پر مایوسی کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بڑی حسرت سے لگاتار دیکھے جا رہی ہیں، کیوں کہ مہینوں گزر جاتے ہیں مگر انھیں شوق سے ڈھونڈنے والا، محبت سے چھونے والا، دونوں ہاتھوں کی رحل میں سجانے والا، آنکھوں اور اپنے سینے سے لگا لینے والا نہ آئے تو ان کی آنکھیں بھی پتھرا جاتی ہیں۔ ایسے میں ایک حسرت اور بے چینی ان میں نظر آتی ہے کہ انھیں چاہنے والے کسی اور طرف مصروف ہو گئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایک انسان ہر طرف سے مایوس ہو جائے تو وہ ایک طرح کا نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ ہر ذی روح میں چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ قدرتی طور پر ودیعت کر دیا گیا ہے اور جب یہ جذبہ شرمندۂ تکمیل نہیں ہو پاتا تو کہیں داخل کی دُنیا میں ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ چل نکلتا ہے، اور ایسے میں وہ نفسیاتی طور پر ضرور متاثر ہو جاتے ہیں۔

کتابیں بھی انتظار میں گھٹ گھٹ کر گویا ایک طرح سے نفسیاتی مریض بن گئی ہیں۔ نظم کا یہ مصرع کہ ''انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے''، اسی نفسیاتی مرض کی طرف اشارہ کر رہا

ہے کہ نیند میں چلنا صحت کی علامت تو نہیں ہے۔

شاعر کو اس بات کا دُکھ ہے کہ آج کل کتابیں پڑھی نہیں جاتیں۔ پہلے کتابوں کے لیے جو وقت دیا جاتا تھا، اب وہ سارا وقت کمپیوٹر اور اس کی برادری، یعنی ویڈیو، ٹی وی یا موبائل فون کے ساتھ دیکھتے، کھیلتے گزر جاتا ہے۔ یہی سبب ہے..... ''جو قدریں وہ سناتی تھیں، کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے، وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں، جو رشتے وہ بناتی تھیں، وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں''۔ سیل ہندی لفظ ہے، جو نمی، ٹھنڈ اور محبت کے معنی دیتا ہے۔ گلزار کا دعویٰ ہے کہ گھروں کے اندر رشتے داریاں کتابوں ہی سے اپنا بھرم باقی رکھ سکتی ہیں۔

'کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے'۔ کتابوں سے رابطہ نہ ہونے پر گھروں میں انسانوں کے درمیان نہ رشتوں کی قدریں باقی رہیں اور نہ محبتیں زندہ رہیں۔ 'سب اُدھڑے اُدھڑے نظر آتے ہیں' یعنی یہ رشتے ناطے، یہ محبتیں، آپسی تعلقات، ایک دوسرے کا لحاظ، ایک دوسرے کو پانے کا جذبہ سب کچھ اپنے آپ نہیں اُدھڑا ہے، بلکہ انھیں کتابوں کی دوری ہی نے اُدھیڑ کر رکھ دیا ہے۔

''کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے''، اس مصرعے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر طرف سے مایوس انسان کو جب اچانک کوئی ہمدرد مل جاتا ہے تو وہ اپنے اس ہمدرد کے گلے لگ کر اس طرح رو پڑتا ہے کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے جو حقیقت سے بہت ہی قریب بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب ایک کتاب مدتوں انسانی ہاتھوں سے دُور ایک ہی جگہ رکھی رہ جائے تو اس کے اوراق اس طرح ایک دوسرے سے چپک جاتے ہیں کہ انھیں الگ کرتے ہوئے ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوا کرتی ہے۔ اسی سرسراہٹ کو شاعر نے سسکی سے تعبیر کیا ہے۔

'کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں'۔ کتابیں جب پارینہ اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں، تو وہ ایک طرح سے ناقابل مطالعہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں کئی طرح کی تبدیلیاں آ جاتی ہیں (جس طرح ایک بوڑھے انسان میں کئی تبدیلیاں آ جاتی ہیں)۔ کرم خوردگی کی وجہ سے جگہ جگہ حرف غائب ہو جاتے ہیں، یا ان کی قدامت کی وجہ سے اکثر جگہ حروف اڑے اڑے نظر آتے ہیں، جس سے بہت سوں کو الفاظ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ایسے میں لفظوں کے معنی گر پڑنے کا مطلب سمجھنا آسان ہے۔

'بنا پتوں کے سوکھے ٹُنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ، جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے'۔ 'ٹُنڈ'

ہندی لفظ ہے اور مذکر مستعمل ہے۔ یعنی درخت کا وہ تنا، یا ڈالی جسے کاٹ دیا گیا ہو اور اس پر کوئی ڈالی یا پتا نہ اُگے۔ جب یہ بھی پتا نہ چلے کہ لفظ کیا ہے تو مطلب کیا سمجھ میں آسکے گا۔ کتاب کے وہ الفاظ جو ٹھیک سے پڑھے نہیں جاسکتے انھیں 'ٹنڈ' کا نام دیا ہے۔

''بہت سی اصطلاحیں ہیں، جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں، گلاسوں نے انھیں متروک کر ڈالا''۔ ان دو مصرعوں میں دو باتیں ہیں: مٹی کا 'سکورا' اور گلاس۔ پانی کے گلاس کے اُوپر رکھا جانے والا ایک چھوٹے سے مٹی کے برتن کو سکورا کہا جاتا ہے۔ سکورا فارسی کا لفظ ہے۔ یہاں غالباً چھوٹی سی پیالی کو سکورا کہا گیا ہے جو پانی کے گھڑے کا منہ بند رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پرانے وقت گھروں میں زیادہ تر مٹی کے برتن ہی استعمال ہوتے تھے، مگر آج کی نسل کو یہ لفظ نامانوس لگے گا، اس لیے گلاس کا لفظ برتا گیا ہے۔

ہر زبان کی کچھ اصطلاحیں ہوتی ہیں اور اکثر یہ اصطلاحیں (کسی خاص لفظ سے مراد معنی لینا اصطلاح کہلاتا ہے) ہمیں کتابیں ہی دیتی ہیں۔ ان کے استعمال سے زبان کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ کتابوں کا مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے بولنے والا زبان کی اصطلاحوں سے ناواقف رہ جاتا ہے۔ جیسے غیر استعمال شدہ چیزیں تہہ خانے میں بکھری پڑی ہوتی ہیں، اسی طرح کتابوں میں اصطلاحات بکھری پڑی ہیں۔ گلاسوں سے تعلق ٹوٹ گیا ہے، اور زبان اصطلاحوں سے خالی ہے۔

''زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحہ پلٹنے کا''۔ یہ اشارہ ہے اُس عادت کی طرف، جو مطالعے کے دوران ہم اپنی شہادت کی انگلی کو زبان سے لگا کر صفحہ پلٹتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ہماری زبان پر ایک قسم کا ذائقہ بھی ہوتا ہے، جسے محسوس کرتے ہوئے مطالعے میں لگے رہتے ہیں۔ ہر کاغذ کا الگ ذائقہ ہوا کرتا ہے، مگر اسے ہم متعین نہیں کر سکتے۔ نئے کاغذات میں ایک طرح کی خوشبو ہوا کرتی ہے۔ بوسیدہ کتابوں میں ایک انوکھی باس رچی بسی رہتی ہے۔

''اب انگلی کلک (click) کرنے سے، بس ایک جھپکی گزرتی ہے۔ بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردے پر، کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے''۔ آج کل مطالعے کے طریقے میں پرانی کتابیں ہاتھ میں لینے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ اب تو ایک سیکنڈ میں انگلی کی حرکت ہوتی ہے اور سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ نہ انتظار کی کوفت اور نہ تلاش کی

مشقت۔ نہ کسی سے مانگنے کی نوبت اور نہ کتابیں لے کر نہ لوٹانے والے سے کوئی شکایت۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارا ذاتی رابطہ جو کتابوں سے تھا وہ منقطع ہو گیا ہے، اور کتابوں کے سلسلے میں پرانے لوگوں میں جو جذبات ہوا کرتے تھے، ان سے شوق کے دریچے خالی ہو گئے ہیں۔

پھر حسرت کو زبان دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''کبھی سینے پر رکھ کے لیٹ جاتے تھے، کبھی گودی میں لیتے تھے، کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے''..... یہ مطالعے کی چند صورتیں ہیں اور ان میں تمام کتابیں اپنی درجہ بندی کے ساتھ تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ یہ صورتیں آج مکمل طور پر نہ سہی مگر ماضی کا قصہ بن چکی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ آنے والی نسل کے لیے ان کی کوئی گنجایش ہی نہ رہے۔

'خدا نے چاہا تو وہ سارا علم ملتا رہے گا بعد میں بھی'۔ بات اگر علم کی ہے تو انسان کہیں سے بھی اور کسی سے بھی پا ہی لیتا ہے۔ معلومات چاہے کہیں سے اور کسی سے بھی ملیں، اگر وہ صحت مند ہوں تو مستحسن مانی جائیں گی۔ ماضی قریب میں انسان کا شوق اسے کتابوں کی طرف لے گیا۔ حال میں انسان کی سوچ بدلی تو اس نے کتابوں کے بوجھ سے خود کو آزاد کر لیا اور تکمیلِ شوق کے لیے اور بھی آسان ذریعہ اسے مل گیا، بقول اقبال: 'کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون'۔ اس بنیاد پر بہت ممکن ہے مستقبل میں اور کوئی نرالا ذریعہ انسان کو مل ہی جائے، جس سے وہ معلومات حاصل کر سکے۔

''مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول، ان کا کیا ہوگا؟''۔ یہ مصرعے ایک رومانوی ماحول میں لے جاتے ہیں۔ ادبی، نیم ادبی اور دینی کتابوں میں رکھے ہوئے سوکھے اور مہکے پھولوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ یہ ہمارے اگلے وقتوں کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔

آج کی نئی پود بالکلیہ نہ سہی عصری علوم کے نام سے اس راستے پر گام زن ہے، جس کی کوئی منزل سمجھ میں نہیں آتی ہے، اور اس نامعلوم منزل کی طرف رواں قافلے کی نظر میں محبت، احترام اور معصومیت وغیرہ فرسودہ تصورات ہیں: 'کتابیں جھانکتی ہیں اور بڑی حسرت سے تکتی ہیں''۔

ایک زمانہ تھا کہ قرآنِ کریم خوب صورت ریشمی غلافوں میں بڑی محبت سے بند کر کے کمروں کی بلند جگہوں پر رکھے جاتے تھے۔ پڑھنے اور سمجھنے کی ترجیح عموماً راہ نہیں پاتی تھی۔ اور اب الماریوں یا شیلفوں میں سجادی جاتی ہیں، خوب صورت کتابیں، گھر کی سجاوٹ کے لیے!